ڈاکٹر خالد اقبال یاسر
لاہور

امن کا طالب: اسد اللہ غالب

Dr Khalid Iqbal Yasir
Lahore.

Ghalib: A Peace Loving Soul

By nature, a normal human being repels and rejects disaster, calamity, war and even verbal squabbles. Ghalib as a civilized man and kind hearted soul never wanted to suffer from pain sorrows and miseries of his times particularly after revolt and upheavals of 1857 and their heinous fallout. He longed for peace as he himself was oppressed by misfortunes and unending hardships. However, he did not befeel of traumas and troubles and faced every crisis bravely as a valiant soldier who converted sword of his valiant ancestors into a pen. He dreamt of peace, security and tranquility for himself and the society. His wish for calm, relief for himself and mankind is metaphorically expressed in poetry and lucidly communicated in his stylish prose. His way of addressing and writing speaks itself of his euphemism, which is an off shoot of humanism and romanticism in literature. His regrets for personal and collective respite was intensely portrayed in his unique, meaningful and suggestive idiom which is not as cheering and solacing as it could have been during peace time.

آدمی اپنی خصلت میں، جبلت میں، عادات میں تضادات کا پُراسرار مجموعہ ہے۔ یہ بیک وقت ظالم بھی ہے اور عادل بھی، لالچی بھی ہے اور قناعت پسند بھی، امن پسند بھی ہے جنگ جو بھی۔ مختلف ماحول تو کیا ایک جیسے حالات میں بھی اس کے رویے اور ردِّعمل مختلف اور خلافِ توقع ہو سکتے ہیں۔ آپ اس کے بارے میں کوئی اندازہ لگائیں تو وہ غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی یا پھر بین بین۔ اس کا مزاج عمر کے ساتھ ساتھ پختہ بھی ہوتا ہے اور بدلتا بھی جاتا ہے آپ آدمی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔

عدالتیں، ریاستیں، قانون ساز ادارے، مذہب، ملت، دھرم جانے کب سے آدمی کی خصلتوں، جبلّتوں اور عادتوں کو حدود و قیود میں لانے کی کوشش میں ہیں لیکن انھیں حتمی کامیابی نہ ہوئی ہے نہ کبھی ہوگی۔ غالبؔ نے اسی لئے کہا تھا کہ ع آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا، کیونکہ ع: بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا۔(۱)

آسانی میں چین ہے، آسودگی ہے، سکھ ہے، اطمینان ہے، آرام ہے مگر یہ آرام بھی خیریت سے ہاتھ نہیں آتا۔

گریۂ خام سے نہیں آیا
چین آرام سے نہیں آیا

(اسلم کولسری)

مگر یہ کیسا آرام ہے جو آ کر بھی نہیں آتا۔ یہ آرام نہیں آرام کی خواہش ہے جو انسان کو رُلاتی پھرتی ہے۔

امن ایک خیال ضرور ہے مگر خیال خام سے زیادہ نہیں۔ یہ ایک خواب ہے مگر بے تعبیر۔ انفرادی طور البتہ کوئی شخص اور خاص طور پر شاعر نظری لحاظ سے امن کوش، صلح کل اور مصلح ہوسکتا ہے جیسا کہ غالبؔ ہوا کرتا تھا مگر اس کے مقدر میں بھی ہر حال میں اس عافیت کی خاطر رونا ہی لکھا تھا جو وقتی طور پر مل بھی جائے تو کسی انتظام سے، قاعدے سے، ضابطے سے برقرار نہیں رہتی۔

اے عافیت! کنارہ کر، اے انتظام چل!
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج (۲)

یعنی گریہ اگر ہو تو گھٹ گھٹ کر ہو، سیلاب نہ بنے، ہجوم نہ کرے، شور نہ اٹھائے، ورنہ: (۳) ع جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں، وہ نالہ رفعِ تنازع کی بجائے وجہِ تنازعہ بن سکتا ہے جب کہ غالب تو امن و عافیت کی خاطر آرزدہ دل کو ہر طرح کا صدقہ پیش کرنے کے لئے تیار رہنے والا شخص ہے۔ امن کا لفظ مترادف ہے پناہ کا، حفاظت کا۔ (۴) اور شاعر تو تیغ کے وار کے سامنے بھی صرف ہاتھوں کو ہی پناہ کیا کرتے ہیں یا اپنے قرار اور بچاؤ کی خاطر محتاط ہو جاتے ہیں۔

کیا پتا دوں تمہیں ٹھکانے کا
امن جاتا رہا زمانے کا

امن ایک آدرش ہے، آئیڈیل ہے نصب العین ہے، انسان کی آرزو ہے۔ شانتی اور سلامتی کی خواہش جتنی شدید ہوتی ہے، ناآسودگی کا احساس بھی اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔ امن کی تمنا جب پوری نہیں ہوتی تو حسرت بن جاتی ہے۔ ہماری شاعری غالب سمیت امن کے لئے اسی حسرت سے لبریز ہے۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا، وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

(غالب) (۶)

عدم تحفظ، کچھ نہ کچھ ہونے کا خوف غالب کے شعروں اور خطوط میں اپنی پوری سنگینی کے ساتھ ظاہر ہو رہا ہے۔ غالب کی نظم سے زیادہ نثر میں نامعلوم شاعر کے اس شعر کی تفصیل و تفسیر ملتی ہے جو اوپر درج ہے اگرچہ ع: ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا، میں غالب خود کو حوصلہ بھی دیتا ہے مگر ہر گھڑی ایک کھٹکا لگا ہی رہتا ہے۔ کسی آفت کے ٹوٹنے سے پہلے کا اضطراب ۱۸۵۷ء کے آس پاس کے خطوط کی سطر سطر سے امڈتا ہے۔ ایسے میں وہ مستقبل کے امن و چین کی خاطر خود کو تسلیاں بھی دیتا ہے اور اپنی عافیت کے لئے اور پھر اپنی افتادِ طبع کے باعث اوروں کو اپنے دل سے دور کرنے کی نصیحت بھی کرتا ہے کہ اس میں آگ دبی ہے، کہیں کوئی جھلس نہ جائے۔ بڑھاپے میں بھی وہ دن رات تگ و دو میں ہی لگا رہا ہے۔ 'دستنبو' کی تحریر سے لے کر نا گفتہ بہ حالات میں کسی نہ کسی طرح اس کی اشاعت کی ساری کہانی عمر کے آخری دہے کو دلجمعی، اطمینان اور آشتی سے گزارنے اور

بھوکے نہ مرنے کی فطری خواہش کے علاوہ اور کیا ہے

غالب انفرادی اور اجتماعی امن وامان کی خاطر اس قلزمِ خون کو بھی برداشت کرنے پر تیار ہے جو اس کے گرد موجزن ہے کیونکہ اسے ڈر ہے کہ آگے اس سے بھی بدتر ہونے والا ہے ''انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا؟ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔'' (۷) جو شخص ہر وقت یہ کہہ رہا ہو کہ ''بھائی، بری آبنی ہے، انجام اچھا نظر نہیں آتا۔'' (۸) اسے اپنی جان کے لالے پڑے ہوں، دارو گیر کا، باز پرس کا، بلائے جانے کا خوف سر پر سوار ہو اس سے زیادہ امن کا طالب اور کون ہوگا۔ وہ تو بار بار اپنی تحریروں میں اپنی صفائی دے رہا ہے کہ ''مع زن وفرزند اسی شہر میں قلزمِ خون کا شناور رہا'' مگر اس نے ''دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا'' (۹) اور ''بادشاہی دفتر میں'' اس کا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا''۔ وہ بار بار اپنی امن پسندی اور عافیت کوشی ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے (۱۰) کہ ''اس فتنہ وآشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا، صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا۔'' (۱۱)

زمانۂ جنگ میں غالب نے اپنے کرائے کے مکان کو پناہ کیا اور دارو گیر سے بھی خدا کی پناہ چاہی یعنی امن وسکون کی آرزو دل میں جگائے رکھی۔ وہ طبعاً صلح پسند، آرام طلب اور آرام پہنچانے والا (Pacifier) تھا۔ وہ جنگ وجدال سے تو کیا بحث و مباحثے سے بھی دور بھاگتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے کوئی ناراض نہ ہو۔ دورانِ جنگ اس نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے اپنے گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف نہیں کیا جیسا کہ ایک دو خطوط میں اس نے بیان کیا ہے۔ گھر میں بند ہونے کا مؤقف اس نے انگریز حکمرانوں کی خوشنودی کی خاطر اختیار کیا تھا تاکہ اس کی باقی عمر امن وسکون سے گزر جائے وگرنہ اس موقف کی تردید اس کے اپنے خطوں سے ہو جاتی ہے۔ غالب تا عمر مصلحت اور مصالحت میں مبتلا رہا۔ وہ کسی سے بھی تعلقِ خاطر توڑنے کا روادار نہیں تھا۔ عبداللطیف کے تاریخی روزنامچے کے علاوہ چنی لال اور گوری شنکر جیسے جاسوسوں کی خفیہ رپورٹوں میں بھی واضح ہے کہ وہ جنگِ آزادی کے مجاہدین سے بھی ہمدردی رکھتا تھا مگر بعد از جنگ کے حالات کے تناؤ میں اس کی عملیت پسندی عود کر آئی۔ غالب بے وفائی کو اپنے لئے داغ گردانتا تھا۔ اس نے واضح کیا کہ اس نے انعامات واعزازات کے لئے انگریزوں کی خیر خواہی میں کچھ نہ کیا اور نہ ہی اس نے اپنے پرانے مربیوں سے بے وفائی کی۔ اسے اطمینان تھا کہ ''کسی طرح کی بے وفائی و نمک حرامی کا دھبہ مجھ پر نہیں لگا۔'' (۱۲) غالب ہر حال متوازن رہا۔ تاہم جھٹپٹے کی کیفیت، گومگو کی حالت کبھی نہ کبھی وقت کے ہاتھوں مصلحت اور مصالحت پسند طبیعتوں کا مقدر بن جاتی ہے۔ غالب بھی آخر آدمی تھا ''دیو نہیں ان رنجوں کا تحمل کیوں کر'' (۱۳) کر پاتا۔ وہ تو اپنے بزرگوں کا اس نابکار عہد سے پہلے مرنے پر بھی شکر کرتا تھا کہ ''وہ اس عہد میں ہوتے تو اپنی آبرو کھوتے'' (۱۴) وہ عہد جس میں غالب نام کے حوالے سے خود کو غصہ دلانے کے لئے چھیڑنے والا کہے مگر ساتھ ہی اسے

بندہ عاجز ہے گردش ایام (۱۵)

بھی کہنا پڑے تو اسے دستنبو، میں انگریز کی زبان بولنی ہوگی۔ مصلحت کی قلم سے لکھنا ہوگا صرف اس لئے کہ اس کو اور اس کے زیر کفالت بیس افراد کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ ایسی مصلحت ہو تو اس میں کیا برائی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تنگ آ کر غالب پنشن ملے نہ ملے کی منزل تک آ پہنچا تھا کہ غالب میں خودداری بھی تھی جو گردشِ ایام کے ہاتھوں قدرے ضعیف ہوئی تھی مگر ختم نہ ہو سکی تھی۔

ع سفر عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی

متصادم گروہوں اور طبقوں کو بیک قلم اور بیک وقت ناراض نہ کرنے کی صلاحیت ہی اعجاز ہے کہ غالب نے 'دستنبو' ایسی زبان میں لکھی جسے پورے ہندوستان میں کوئی پڑھنے والا اور سمجھنے والا نہ ملے تا کہ جنگِ آزادی کے مجاہدین اور انگریز سامراج کے مزاحمت کاروں میں اس کا بھرم قائم رہے اور انگریزوں سے مطلب براری بھی ہو سکے۔ حجابِ پاس وضع کا مارا ہوا غالب اتنے دگرگوں حالات میں اور کیا کر سکتا تھا کہ ایسی جناتی زبان لکھے جسے ممدوح بھی نہ سمجھ پائے۔ اسی لئے جب اسے پتا چلا کہ 'صاحب نے سن کر اس کو پسند کیا' تو وہ حیران ہوا کہ ''کون سا مقام تم نے'' یعنی اطلاع دینے والے نے صاحب کے آگے پڑھا ہوگا۔ کیوں کر کہوں کہ صاحب 'دستنبو' کی اس عبارت کو سمجھے ہوں گے۔'' (۱۶) یہ ساری داستان ایک مصالحت پسند مزاج کا پتا دیتی ہے۔ امید وبیم کے دوراہے پر کھڑے اس شخص کو اس کیفیت سے اور بھی پریشانی لاحق ہے کہ نہ جزا، نہ سزا، نہ نفرتیں، نہ عدل، نہ ظلم، نہ لطف، نہ قہر، نہ ردوقبول، یعنی غالب کا مدعا یہ ہے کہ رشتہ باقی رہے چاہے جیسا بھی ہو۔

شعروں میں بھی غالب کا یہی مزاج بار بار جھلکتا ہے

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی (۱۷)

O

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو؟
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو؟ (۱۸)

کیونکہ غالب کسی بھی حال میں ترکِ وفا کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی (۱۹)

بلکہ وہ تو بیدادِ دوست کو اپنی جاں کے لئے نویدِ امن قرار دیتا ہے کہ اس کے بعد آسماں کے پاس کوئی اور طرزِ ستم باقی ہی نہ رہے گی

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لئے ہوتے (۲۰)

اب اس سے زیادہ صلح طلبی اور امن خواہی Pacifism کیا ہوسکتا ہے کہ دشمن سے بھی محبت کا رشتہ قائم کیا جائے اور اسے اپنا بنانے کی حسرت دل میں پالی جائے۔ اب آپ اس شعر کا مخاطب انگریز سمجھیں، بہادر شاہ ظفر خیال کریں یا محض محبوب، امن وامان بہرحال غالب کا مطمحِ نظر دکھائی دیتا ہے

قبلۂ کون و مکاں! خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل (۲۱)

کسی کی بے نیازی کے باوجود تسلیم کی خو ڈالنے والے ہی نہ جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہیں، تنازع للبقاء میں پرامن بقائے باہمی (Peaceful Co-existance) غالب کا منشا رہا ہے۔ اسی لئے غرور وعزّ و ناز میں اس نے حجابِ پاسِ وضع کو تاعمر برقرار رکھا ہے چاہے وضعِ احتیاط سے اس کا اپنا دم رکنے لگے۔ وہ بوسہ نہ ملنے پر دشنام پر گزارا کرنے کے لئے

بھی تیار ہے۔ اپنی آہوں کو اپنے چاک چاک گریباں کا بخیہ سمجھنے والا دکھ دینے والے کو بھی میں نہیں دیکھ سکتا۔

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب ! اسے قسمت میں عدو کی (۲۲)

پرامن بقائے باہمی ہر معاشرے میں باہمی احترام، تشدد سے باہمی عدم مداخلت، باہمی مساویانہ برتاؤ اور باہمی مفادات کے لحاظ (۲۳) کے بغیر ممکن نہیں۔ غالب کے مزاج میں سنسکرت کے یہ پنچ شیل یوں آمیز ہیں کہ انہیں کسی نامیاتی تجربے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ غالب کی طبیعت ان پانچوں اصولوں کے اثر آفریں امتزاج سے تشکیل پائی تھی۔ غالب نے مدنی اور تہذیبی ارتقاء کے اس مرحلے پر ظہور کیا تھا۔ جب ایسی اخلاقی روایات معاشرہ میں جڑ پکڑ چکی تھیں اور وہ اجتماعی شعور اور عمومی رویے کا حصہ بن چکی تھیں، ع کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے، وفاداری بشرطِ استواری کے حوالے سے، ع مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو اور، ع ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم، اسی باہمی بقاء کے جذبے کے آئینہ دار مصرعے ہیں۔

امن پسندی اور صلح طلبی (Pacifism) ایک اندازِ نظر ہے اس کی تفصیلات اور اقسام بھی عہد جدید میں بطور اصطلاح اور نظامِ فکر طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قوموں کے درمیان جنگوں کی مخالفت اور صلح کے لئے حالات کی سازگاری کا عمل امن پسندوں کو مرغوب ہوتا ہے۔ انفرادی سطح پر بھی تکرار، لڑائی، بحث اور مجادلہ امن خواہوں کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔

باہمی مفادات یا باہمی مساوات کی خاطر ایک دوسرے کے حقوق کا بھی پاس رکھنا اور مل جل کر یا مل بانٹ کر رہنا بقائے باہمی کو تقویت دیتا ہے، مفادات میں کسی کو شریک کرنا کتنا مشکل ہے مگر اس معاملے میں غالب بازی لے گیا۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟ (۲۴)

صلح جوئی کو زندگی کے قرینے کے طور پر برتنے والا غالب کی طرح، ع آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟ کی فکر میں غلطاں رہتا ہے اور ع گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے یا عام طور پر، ع بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں، سے گزر کر بزمِ ناز کو غیر سے تہی کرتے کرتے ایک سراپا ناز ستم ظریف کے کہنے پر بزم سے چپ چاپ اٹھ بھی جاتا ہے۔ ایسے صلح جو غالب کی طرح ۱۸۵۷ء جیسے جنگ و جدال سے کوئی عملی واسطہ نہیں رکھتے کہ ان کے مزاج کو جنگ سے مناسبت نہیں ہوتی۔ مگر غالب کے اجداد کی طرح نہ سہی مگر ایک عام انسان کی طرح جنگ کو امن کے پیش خیمے یا سبب کے طور پر قبول بھی کرتے ہیں بار بار کی اشتعال انگیزی سے تنگ آمد بجنگ آمد کی حالت بھی پیدا ہوسکتی ہے۔

امن طلب جنگ آزما بھی امن پسند (Pacifist) کی کتابی تعریف سے باہر نہیں ہوجاتا۔ (۲۵) تاہم غالب ایسے کسی امتحان میں ناکام نہیں ہوا حالانکہ اس کے اجداد سورما تھے اور وہ سلجوقی النسل ترک تھا۔ اس میں صلح جوئی شاید اس کے والد اور چچا کے جنگوں میں کام آنے کے سبب پیدا ہوئی ہو۔ بالخصوص اس لئے کہ چچا کی ہلاکت کے بعد اس کی جانِ حزیں وقفِ آلام ہوگئی تھی۔ غالب کی شاعری میں دشواری اور آسانی کے Paradoxes بڑی معنی آفرینی کے ساتھ کہیں اسی لئے تو تواتر سے نہیں ملتے کہ اس کی زندگی عزلت اور سہولت کے نشیب و فراز سے گزرتی رہی تھی۔ زندگی کی باہم تلخیوں اور دردوں کے اشتراک نے اسے بقائے باہمی کا سبق ازبر کروایا تھا، ع : ہے ایک تیر جس سے دونوں چھدے پڑے ہیں، کا ادراک ایک دوسرے کا احساس

دلوں میں جگاہی دیتا ہے۔ دل سے کسی نگاہ کے جگر تک اترنے اور دل وجگر دونوں کو اک ادا میں چھید نے کو رضامند کرنے کے عمل کو تخلیوں، خوش کلامی اور حسن ادا سے رفع کرنے اور سنگین معاملے کو گوارا بنانے کی اس خوبی پر محمول کرنا چاہیے جو کسی خوش آہنگ شاعر کا خاصہ ہوتا ہے اس حربے کو اصطلاحی طور پر Euphemism کہتے ہیں جسے سادہ الفاظ میں ''ناروالفظ یا فقرے کو بدل کر اس جگہ نرم اور خوشگوار لفظ یا فقرے کا استعمال'' (۲۶) کہا جاتا ہے یہ اصطلاح اولاً لسانیات کی ہے اور ثانیاً شاعری کی۔ دیکھا جائے تو 'دستنبو' کی زبان بھی ایک لحاظ سے خوش کلام (Euphemist) کی زبان ہے یا کم از کم اس زبان کے استعمال کا مقصد وہی ہے جو کوئی Euphemist لسانی حربے سے حاصل کرنا چاہتا ہے کہ دونوں متحارب فریقوں کی دلآزاری نہ ہو۔

گریے کو جزحسنِ طلب کچھ نہ کہنے اور تیزیٔ تیغ وسناں کی بجائے جوشِ اشک سے تہیۂ طوفان کیے ہوئے غالب ایک ایسا معنوی مگر بالواسطہ Euphemist ہے جس کا ساری نثری اور شعری سرمایہ ناگوار طرزِ اظہار و بیاں اور ناروا الفاظ سے بے مایہ نہیں ہوا۔ اس نے ظلم اپنی جان پر تو سہا مگر تلوار تو کیا اٹھانا تھی احتجاج بھی بآواز بلند نہیں کیا اور دشنام طرازی بھی نہ کی۔ قلم سے ع: وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے، کہنے کے باوجود زباں سے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری (۲۷)

O

ازبستہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے (۲۸)

یعنی کہ داغ ہی ابلاغ ہے، براہِ راست دوٹوک ابلاغ۔

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے (۲۹)

منھ میں زبان رکھتے ہوئے وہ مدّعا پوچھنے کا منتظر ہے ورنہ ع: ہے ایسی ہی بات جو چپ ہوں اور ایسا شاید مرّوت کے سبب ہے۔

پر یار کے آگے بول سکتے نہیں
غالب منھ بند ہو گیا ہے گویا (۳۰)

اور اگر بولے بھی تو اصرار و تکرار کے لئے نہیں محض تجدید کے لئے ع

تکرار گر روا نہیں تجدید ہی سہی (۳۱)

تکرار کو تجدید کہنا تو سیدھا سیدھا Euphemism ہے کیونکہ تکرار کے مقابل تجدید نسبتاً بے ضرر متبادل ہے اور کسی جارحانہ اور تیکھے لفظ، محاورے فقرے یا ضرب المثل کو کسی بے ضرر لفظ سے بدل کر استعمال کرنا Euphemism کی تعریف میں آتا ہے۔ (۳۲) بلکہ ایک اور شعر میں تو غالب ''الاماں'' کو زمزمہ ہی نہیں کہتا بلکہ اس زمزمے کے حوالے سے 'ھل من مزید' کو 'ترانہ' شمار کرتا ہے

انفعالیت، پژمردگی، بے زاری، اضمحلال، سستی یا ضعف بھی لڑائی سے گریز اور امن کی خواہش کی وجہ ہوسکتی ہے اور غالب کے ہاں بھی اس احساس کی فراوانی ہے ع: سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی والا قصہ غالب کو یہاں وہاں درپیش رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تلوار اٹھانے کے لئے ہمت چاہئیے اور ہمت کے لئے اور اس کے بعد توانائی بھی درکار ہوتی ہے اگر دونوں میں سے ایک اہلیت یا خوبی نہ ہو تو جنگ نہیں ہوسکتی۔ اپنی کمزوری کے اور اک کے سبب سمجھوتہ، پس قدمی اور صلح ممکن ہوتی ہے ناصح کی شدت کے باوجود خم ٹھونک کر اس کے ساتھ نہ لڑنے کی نصیحت کا سبب جنگ سے گریز سے زیادہ اپنی کمزوری اور مجبوری ہے۔ اپنے گریباں پر زور مجبور ہی کا چلتا ہے ورنہ معاملہ ناصح کے گریبان تک ضرور پہنچتا ہے۔ ایسا شخص تو شکوہ شکایت سے بھی گریز کرتا ہے کہ باہم تلخی نہ بڑھے۔

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہئے تو گلہ ہوتا ہے (۳۳)

غالب جرأت اور حوصلے کو انسانی زندگی کے تسلسل اور دنیا کی آبادی کے لئے ضرر رساں کہتا ہے کہ یہی خوبی یا خامی مخاصمت، معاندت اور جدل کا سبب بنتی ہے اس کے نزدیک ع: رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے (۳۴) حالانکہ اپنی بے ہمتی اور انفعالیت کے سبب وہ جانتا ہے کہ

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوک بے داد کہ ہم
خود اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے (۳۵)

غالب جیسے آرام طلب ہر طرح کے حالات میں اپنی تسکین کا سامان تلاش کر لیتے ہیں بلکہ دشمن کی وکالت اور صفائی کا فریضہ بھی اندیشۂ امن کے سبب خود ہی سنبھال لیتے ہیں، ع: ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی (۳۴) ذرا خلوصِ اظہار تو ملاحظہ فرمائیے، ایسے لہجے میں اپنی صفائی پر دشمن خود بھی قادر نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں تو وہ سارا الزام ہی اپنے سر لے لیتا ہے یا تقدیر کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

O

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر بھی تھا (۳۸)

O

نہ کہو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو 'بجا کہئے، (۳۹)

اور جیسے اتنا کچھ ستمگر کے حق میں کہنا کافی نہیں، غالب اس کے ان احسانات کو بھی اس کے حساب میں لکھ لیتا ہے جو اس نے لاعلمی میں احسان کے ارادے سے نہیں کئے تاکہ وہ خوش رہے اور باہم امن وامان مستحکم ہو۔

ضد کی ہے بات اور مگر خُو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے (۴۰)

امن درحقیقت ہر فلسفے کی روح ہے بہت سے افکار، نظریئے اور اصطلاحیں امن کی خواہش سے مربوط ہیں۔ انسان دوستی (Humanism) امن کے پرچار ہی نہیں امن کے نفوذ کے بغیر ممکن نہیں۔ انسانی مسائل اور دکھ سکھ کا تخلیقی اظہار کسی شاعر کی انسان دوستی کا پیمانہ ہوتا ہے اور اس کی دردمندی اور اثر آفرینی کا بھی۔ خیالِ خاطرِ احباب اس لئے ضروری ہے کہ انسان کا انسان سے تعلق آبگینے کے موافق ہے اور آبگینوں کو ٹھیس پہنچانا شاعر اور شاعری کا منصب نہیں۔ اگر آدمی غالب کے خیال میں مشکل ہی سے صحیح انسان بن جائے تو ظالم بھی انسانیت پرور ہو جائے۔ شاعری محض حظ کا سامان نہیں، بوجھ ہے، قرض ہے، ذمہ داری ہے، شاعر کو اپنے خونِ جگر کے ایک ایک قطرے کا حساب غالب کے الفاظ میں دینا پڑتا ہے کہ اس کا اپنا خونِ جگر مژگانِ یار کی امانت ہے۔ ہر فطری شاعر کی طرح غالب کی نظم ونثر میں 'سب کا بھلا سب کی خیر' کی چاہتبین السّطور موجیں مارتی ہے۔ غالب کا دکھ یہ ہے کہ وہ آئینہ ٹوٹ گیا جس میں اس کے شہرِ آرزو کی تمثال موجود اور اس کے امکانات بند تھے۔ اس آئینے کے ٹوٹنے سے آئینے کی وحدت منتشر ہوئی۔ کسی کی ذرا سی بے احتیاطی سے شہر بھر کا سکون اور اطمینان غارت ہوا۔ یک شہرِ آرزو کا ماتم، اس فشار، انتشار اور اضطراب کے سبب سے ہے۔ ایسے اشعار سے غالب کی امن خواہی کی حدود پھیل کر رومانیت اور جمالیات کی وسعتوں کو اپنے جلو میں لے لیتی ہے جمالیات اور رومانیت کا مقصد بھی بنی نوعِ انسان کے لئے سہولتیں اور آسانیاں پیدا کرنا ہے ان تصورات کے اطلاق سے معاشرہ امن وامان کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ غالب نے اپنے کئی اشعار میں ''زندگی کو کیف وسرور کے ساتھ بسر کرنے کی تمام تر صورت حال کو انسان کے اپنے بس کی چیز بنا کر پیش کر دیا ہے۔''(۴۱)

دراصل ہر طرح کی آسودگیاں، آسانیاں، سہولتیں امن وامان سے وابستہ ہیں۔ امن وامان ہر سماجی۔ ادبی تحریک کی اساس ہے انسان دوستی (Humanism) جمالیات (Easthatics) اخلاقیات (Ethics) صلح پسندی (Pacifism) خوش کلامی (Euphemism) اور رومانویت (Romancism) جیسے نظریات اور افکار ایسے آدرشوں کی پرورش کرتے ہیں جو انسان کی زندگی کے لئے زندگی کو سازگار، سکون آور اور مسرت بخش بناتے ہیں۔ غالب خلقِ خدا کی بے لوث خدمت کے مدعی ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے یادگارِ غالب میں 'فخریہ' کے زیرعنوان ایک فارسی شعر درج کیا ہے جس میں غالب نے خود کو ایسی شمعِ شبستانی سے تشبیہ دی ہے جس میں سے شعلے جھڑکتے ہیں اور ایسی بادِ سحرگاہی کہا ہے جو پھول کھلاتی ہے مگر اس کی اجرت کوئی ادا نہیں کرتا، وہ اجرت سے بے نیاز ہوتی ہے۔(۴۲)

غالب انسانی فلاح اور سلامتی کے لئے دست بدعا رہتا ہے۔ دعا وہی مانگتا ہے جو امن کوش ہو، دوسروں کے لئے راحت کا طلب گار ہو شانتی، آشتی اور سکھ کا خواہش مند ہو ع: گن کے دیویں گے ہم دعائیں سو بار، کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی امیدیں اور توقعات اور بھی سوا ہیں۔

ہر امّتِ تو دوزخِ جاوید حرام است
حاشا کہ شفاعت نہ کنی سوختگان را (۴۳)

لیکن آل احمد سرور غالب کو ایک ایسی رنگین شخصیت سمجھتے ہیں جو مذہبی اور اخلاقی سہاروں کی بجائے انسانی سہارے

ڈھونڈتی ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے (۴۴)

سرور، غالب کی شاعری کو حدیثِ دلبراں سے بڑھ کر حدیثِ زندگی، سے تعبیر کرتے ہیں، رفیق خاور بھی غالب کو زندگی کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ غالب ایسی زندگی کے شاعر ہیں جو اس عہد کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی تھی اور وہ زمانہ امن کی زندگی کے طالب تھے، ایسی زندگی نہیں کہ جس میں

ہے خلقِ صد قماش لڑنے کے لئے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورت کاغذ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے (۴۵)

بلکہ ایسی تسکین و تمکین بھری زندگی

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے (۴۶)

اور ایسی آرائش اور آسائش امن و امان اور ذہنی آسودگی کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ غالب کی عافیت کوشی پر توجہ کا ارتکاز موضوع کا تقاضا تو ہے لیکن اس سے یہ تحریر موضوعی ہو جائے گی معروضی نہیں ہو سکے گی۔ ذرا سی توجہ اور دی جائے تو غالب کی امن پسندی اس کی حقیقت پسندی کی بھی آئینہ دار ہے۔ انتہائی دگرگوں حالات میں اس کی عملیت پسندی اس دور کے حالات کے باعث بروئے کار آئی ہے۔

جنگ و جدل اور فتنہ فساد کے مابین لطیف سے فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے غالب کے نسلی مزاج کا تعین کیا جائے تو فنِ حرب اور سپہ گری اس کے لہو میں شامل تھی۔ دوسری طرف امن کوشی اور بزدلی کے درمیان بھی تفریق ضروری ہے۔ غالب جنگ و جدل سے نہیں فتنہ فساد سے گھبراتا تھا۔ وہ عافیت چاہتا تھا مگر بزدل ہرگز نہ تھا۔ وہ اپنے خطوط میں بار بار اپنے دوستوں کو باور کراتا ہے کہ وہ مجاہدین کی دلی پریورش کے دوران شک و شبے کی فضا اور انگریزوں کی فتح کے بعد مسلمانوں کے قتلِ عام، غارت گری، عبرت ناک سزاؤں اور املاک کی بربادیوں اور ہولناکیوں میں بھی ہراس، خوف یا ہول کا شکار نہیں ہوا۔ غالب نے ان خون آشام حالات کا مقابلہ مردانہ وار کیا۔ اپنے پرزے اڑنے کا تماشا خود دیکھنے کا حوصلہ غالب جیسے کسی کسی شخص میں ہی ہو سکتا تھا ہتھیار اٹھانا اس کا منصب نہ تھا۔ سکّہ البتہ اس نے لکھا تھا جس سکے کے لکھنے کا الزام اس نے اپنی معاملہ فہمی اور عملیت پسندانہ حرکتوں سے تا دیر ٹالے رکھا تھا۔

غالب نے ہوش سنبھالا تو ہندوستان طوائف الملوکی کا شکار تھا۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کے باعث دُور دراز کے باج گزاروں نے باج دینا بند کر دیا تھا بلکہ سرکشی اختیار کر لی تھی۔ سرکوبی کے لئے بھیجی جانے والی افواج شکستوں سے دوچار ہو رہی تھیں۔ انگریز تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کے تحت قدم بقدم دارالسلطنت کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ذرائع آمدن

کم ہو رہے تھے۔ راجوں مہاراجوں کے درمیان جنگوں اور شورشوں میں سپاہی اور سالار کام آ رہے تھے اور ان کے بعد ان کے لواحقین کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ شورشوں میں کام آنا اتنا قابلِ فخر بھی نہ رہا تھا۔ اگر کسی کا باپ اور اس کے بعد ہمدرد چچا بھی ایسی جنگوں میں کام آ جائے اور اس کا کوئی پرسانِ حال نہ رہے تو وہ سپہ گری بھلا کیسے اختیار کرے گا۔ امن وسکون ایسے کسی خاندان اور اس کے سربراہ کی مجبوری بن جاتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ کسی کے دامن کو حریفانہ کھینچے مگر بالآخر اسے حالات سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ بھائی غالب کا دیوانگی میں چل بسا، اس کی بیوہ اور بچے بھی غالب کی ذمہ داری تھے۔ قرض کی مے پی کر اپنا بھرم رکھنے کو پنشن کے بقایا جات ملے تو اس کا قرض ادا ہوا۔ فساد کے بعد اس نے سکون کی خواہش کی۔ لکھنؤ کی نئی تعمیرات پر خوش ہوا مگر دِلّی کی ویرانی جیسے اس کی روح کے اندر اتر گئی تھی۔ کس جلے دل سے غالب نے کہا ہوگا کہ جب وہ اہلِ شہر ہی نہ رہے جن سے رسم وراہ تھی تو وہ شہر کو کیا کریں، کیا شہر لے کر چولہے میں ڈالیں۔

وہ زورِ بازو جو غالب کے اجداد نے میدانِ جنگ میں دکھایا غالب نے وہی زورِ حیات و کائنات کے مسائل سے نبرد آزمائی میں آزمایا۔ کوئی بڑے دل والا ہی بے مثال دلیری سے اپنے سلجوقی اور افراسیابی حسب ونسب کی بے حرمتی کو اتنی حقیقت پسندی سے بیان کر سکتا ہے شاعری اور فارسی دانی پر اترانے والے کو جوتیاں پڑنے پر خوش ہو سکتا ہے۔ بندگی میں اتنا آزادہ خود بین انسان جو درِ کعبہ وا نہ ہونے پر الٹا پھر آتا ہے، بزاز، میوہ فروش، صراف اور گندھی سے قرض لیتا ہے۔ اور ان کے ہاتھوں بطور قرض دار اپنے رنج و ذلّت سے خوش ہوتا ہے۔ غالب جیسا انا پرست، خود دار اور بخود خزیدہ انسان اپنی ضرورتوں اور حاجتوں سے مجبور ہو کر اپنے لئے اپنی سزا خود تجویز کرتا ہے۔ اپنے آپ سے تو لڑتا ہے مگر قرض خواہوں سے تکرار نہیں کرتا۔ یعنی معاشرے کا امن برباد نہیں کرتا۔ اگر حالات سازگار ہوتے، مغلیہ سلطنت توسیع پذیر ہوتی۔ اس کے لشکرِ جرار فتح پر فتح حاصل کرتے جاتے، مرکزی حکومت مضبوط ہوتی، کوئی مغل بادشاہوں کے سامنے دم نہ مارتا تو غالب شاید شاعر نہ ہوتا بلکہ مغل لشکروں کے ہم رکاب ان کا بازوئے شمشیر زن ہوتا، جیسا کہ اس کے آباواجداد کرتے تھے۔ عہدِ زوال میں پے در پے شکستوں کے بعد مغلیہ سلطنت کیسکڑ کر از دلی تا پالم رہ جانے پر غالب اپنے اجداد کی ٹوٹی ہوئی تلوار کو قلم بنا لینے کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے۔ افواج کا حال سودا کی ہجو کے مطابق جب یوں ہو جائے کہ پیادے نائی سے سر منڈاتے ہوئے ڈر جائیں اور سوار سوتے میں چارپائی سے گر جائیں تو غالب ایسے لشکر کا سپاہی ہونا کیسے گوارا کرتا۔ تاریخ کے اس موڑ پر تو غالب خوابوں کا کاروبار ہی کر سکتا تھا۔ برہانِ قاطع اور قاطعِ برہان جیسے علمی معرکے لڑ سکتا تھا۔ قتیل کے مداحوں کا سامنا کر سکتا تھا، پنشن کے مقدمات میں استقامت دکھا سکتا تھا، تلوار نہیں اٹھا سکتا تھا۔ رجز نہیں لکھ سکتا تھا۔ وہ دخانی جہاز کے بعد دخانی ریل، ماچس، بجلی کے بلب، میکانیکی تکلے، پن ہول کیمرے اور آپ ہی آپ ٹھیس لگنے سے خود ہی بج اٹھنے والی ساعتِ عیسویاں کی طرف سرسید کی توجہ مبذول کرا سکتا تھا۔ یہی وقت کا تقاضا تھا اور غالب نے ہتھیار اٹھائے بغیر ایسی معاشرتی تبدیلیوں کی بنیاد رکھی جو بالآخر پُرامن تحریکِ آزادی کی کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ غالب کی ذاتی زندگی کے نشیب وفراز اور تاریخی کروٹوں میں اس کی شاعری اور نثر ایک انسان دوست، امن پسند اور معاملہ فہم کردار کا پتا دیتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں غالب اول وآخر ایک مہذّب اور صلح کل انسان تھا۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ غالب: کلّیاتِ غالب، مرتب ومترجم: ڈاکٹر خالد حمید شیدا، سورج پبلشنگ بیورو، ۲۰۰۸ء ص۔۵۳۲۔

۲۔ غالب: انتخابِ غالب بہ تصحیح امتیاز علی عرشی، مطبوعہ قیمہ، بمبئی، ۱۹۴۲ء ص۔۲۰۸۔

۳۔ ایضاً: ص۔۲۲۵۔

۴۔ جامع اللغات، جلد اوّل: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۰ء، ص۔۲۲۶، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد اوّل، ترقی اردو بورڈ کراچی، ۱۹۷۷ء، ص۔۸۵۴

۵۔ فرہنگِ آصفیہ: جلد اول، اردو سائنس بورڈ ۲۰۱۰ء ص۔۲۲۷۔

۶۔ غالب: کلیّاتِ غالب مذکور ص۔۵۵۱۔

۷۔ غالب: مکتوب بنام تفتہ، ۳۱ جنوری ۱۸۵۸ء بحوالہ غالب کے خطوط، جلد اول، مرتبہ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۶۹۔

۸۔ غالب: مکتوب بنام تفتہ ۳ فروری ۱۸۵۸ء، کتاب مذکور ص۔۲۶۹۔

۹۔ غالب: مکتوب بنام چودھری عبدالغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء، کتاب مذکور، جلد دوم ص۔۶۰۸۔

۱۰۔ غالب: مکتوب بنام تفتہ ۱۲ مارچ ۱۸۵۸ء، کتاب مذکور، ص۔۲۷۲۔

۱۱۔ غالب: مکتوب بنام تفتہ، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء، ص۔۲۶۷۔

۱۲۔ غالب: مکتوب بنام نواب حسین مرزا، ۱۸ جون ۱۸۵۹ء، کتاب مذکورہ جلد دوم، ص۔۶۷۴۔

۱۳۔ غالب: مکتوب بنام یوسف مرزا، ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء، کتاب مذکور جلد دوم، ص۔۶۷۷۔

۱۴۔ غالب: مکتوب بنام یوسف مرزا، جون، ۱۸۵۹ء، کتاب مذکور جلد دوم، ص۔۶۸۷۔

۱۵۔ غالب: دیوانِ غالب معہ فرہنگ، مکتبہ جمال لاہور ۲۰۰۴ء، ص۔۴۱۳۔

۱۶۔ غالب: مکتوب بنام آرام، ۳۱ اگست ۱۸۵۸ء کتاب مذکور جلد سوم ص۔۱۰۵۲

۱۷۔ غالب: انتخاب غالب بہ تصحیح امتیاز علی عرشی مذکور، ص۔۲۴۷۔

۱۸۔ غالب: کلیات غالب مذکور، ص۔۴۱۶۔

۱۹۔ غالب: انتخاب غالب، مذکور ص۔۲۴۸۔

۲۰۔ غالب: ایضاً: ص۔۲۶۶۔

۲۱۔ غالب: دیوان غالب، مذکور، ص۔۲۳۹۔

۲۲۔ غالب: ایضاً: ص ۳۱۷

۲۳۔ Wikipedia, The free encyclopedia

۲۴۔ غالب: انتخاب غالب مذکور، ص۔۲۳۹

۲۵۔ International Encyclopedia of Philosophy

۲۶۔ قومی اردو لغت مذکور،ص۔۲۳۹۔

۲۷۔ غالب: انتخاب غالب مذکور،ص۔۲۶۸۔

۲۸۔ غالب: ایضاً ص۔۲۶۸۔

۲۹۔ ایضاً: ص۔۲۷۳۔

۳۰۔ غالب: دیوان غالب مذکور،ص۔۲۶۴

۳۱۔ ایضاً: ص۔۴۶۵۔

۳۲۔ Wikipedia, The free encyclopedia

۳۳۔ غالب: انتخاب غالب مذکور،ص۔۲۶۴

۳۴۔ ایضاً: ص۔۲۶۷۔

۳۵۔ ایضاً: ص۔۲۶۴۔

۳۶۔ ایضاً: ص۔۲۴۶۔

۳۷۔ ایضاً: ص۔۲۴۱۔

۳۸۔ ایضاً: ص۔۲۰۱۔

۳۹۔ ایضاً: ص۔۲۸۰۔

۴۰۔ ایضاً: ص۔۲۴۸۔

۴۱۔ مشکور حسین یاد: غالب کا جمالیاتی شعور، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۷ء ص۔۸۴۔

۴۲۔ غلام رسول مہر: افکارِ غالب کے نئے زاویے مشمولہ، صحیفہ کتاب غالب، ا مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۔ ۲۷۰۔ بحوالہ یادگارِ غالب از خواجہ الطاف حسین حالی۔

۴۳۔ غالب: کلیات غالب مذکور: ص۔۴۸۔

۴۴۔ ایضاً: ص۔۶۶۷۔

۴۵۔ غالب: انتخاب غالب مذکور،ص۔۳۱۷۔

۴۶۔ غالب: کلیات غالب مذکور،ص۔۳۹۷۔